کوئی مخصوص طرزِ حیات تو نہیں رکھتی جسے اپنائے بغیر اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ جناب آدم علیہ السلام سے النبی الخاتم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک تمام انبیا اور رسل نے اسلام ایسے دین اور ضابطۂ حیات کی تبلیغ اور اس کے اصولوں کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایمان کی روشنی میں ہم یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی امت کو اسلام ہی کا پیغام دیا تھا مگر قرآن کے دعویٰ کے مطابق اہل کلیسا ارباب من دون اللہ (یعنی مقتدرِ اعلیٰ) بن بیٹھے (التوبۃ: ۳۱) تاکہ وہ اپنی خواہشات کو تعلیمات الٰہی (یعنی آئین) کا درجہ دے سکیں جب کہ قیصر نے اہل کلیسا کی اس حیثیت کو اپنے اقتدار کے لیے چیلنج سمجھا۔ پھر کیا تھا ان دونوں کے درمیان حصول اقتدار کی ایک طویل کشمکش کی تاریخ رقم ہوئی۔ ایک ہی میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک تلوار ٹوٹ گئی جس کے نتیجے میں اہل کلیسا نے تسلیم کر لیا کہ زمین کا خدا (قیصر) آسمان کے خدا کے احکامات (جو اہل کلیسا نے اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیے یا انھیں خود گھڑ کر خدا کے نام منسوب کر دیا تھا) کا پابند نہیں۔ پھر بھی اہلِ کلیسا نے عوام کو "عقیدے کے ڈنڈے" سے ہانکنے کی کوشش جاری رکھی جس کے ٹوٹنے سے وہ خود بھی دھڑام سے نیچے آ گئے اور عوام قیصر کی تلوار کو ہی امن کا پرچم تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جب قیصر نے ان کا عرصۂ حیات تنگ کیا اور اقتدار کی تلوار ان کے سروں پر لٹکائی رکھی تو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مراحل (ہابز کا نظریہ مطلق العنان حاکمیت، شاندار انقلاب اور لاک کا نظریہ عوامی حاکمیت، انقلاب فرانس اور روسو کا نظریہ عوامی اقتدار اعلیٰ وغیرہ) سے دو چار ہو کر جمہوریت کو اپنایا۔ اہلِ کلیسا کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکے تھے، تعلیماتِ الٰہیہ بھی اصل صورت میں موجود نہیں تھیں اور قیصر نے بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے تلوار کا سہارا لے رکھا تھا اس لیے اہلِ مغرب نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ہر امر کا فیصلہ صرف کثرت رائے کی بنیاد پر ہوگا کیونکہ اس کے سوا حق و باطل کی پیمائش کا ان کے پاس کوئی معیار اور پیمانہ ہی نہیں تھا۔

جمہوریت پر ایمان لانے والوں کی مجبوری

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کی مجبوری جمہوریت پر ایمان لانے والوں کی مجبوری

کیوں بنی؟ حالانکہ مسلمان عیسائیوں کی طرح مجبور نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں پیشوائیت نے بھی اہل کلیسا کا سا کردار ادا کیا ہے لیکن مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پاس اصل تعلیمات محفوظ ہیں اور ہر طالب علم ان کے اصل رنگ میں خود کو رنگ سکتا ہے جس کے پیش نظر پیشوائیت کا کوئی فسوں ان کے ذہنوں کو زنگ آلود نہیں کر سکتا ہے۔ آخر مسلمانوں نے کس مجبوری کے تحت اس نظام کو اپنا ہی نظام تصور کر لیا۔ جو اسلام ایسے ضابطۂ حیات ہی نہیں بلکہ عیسائیت کے مخصوص عباداتی تانے بانے سے بھی بیگانگی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ جمہوریت پر ایمان لانے والے مسلمان اس موقعہ پر یہ کہنے کے عادی ہیں کہ وہ بے لگام مغربی جمہوریت کو سند جواز عطا نہیں کرتے جس میں عوام کو حاکمیت اعلیٰ حاصل ہے اور جس میں سے سوا فراد میں سے اکیاون بیک وقت شراب کو جائز یا ناجائز قرار دے سکتے ہیں بلکہ ہم تو بحمد اللہ، اللہ تعالیٰ کو ہی مقتدر اعلیٰ اور حاکم اعلیٰ تصور کرتے ہیں اور پوری دنیا میں اللہ کی حاکمیت کا پھریرہ لہرانا چاہتے ہیں بلکہ ہم جمہوریت سے تو اس حد تک اتفاق کرتے ہیں جس کی اجازت اسلام (مسلمانوں کا ضابطۂ حیات) دیتا ہے یعنی باہمی معاملات مشورہ اور رائے سے طے کرنا۔ ثبوت کے لیے وہ قرآن مجید کی دو آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن میں سے ایک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا ہے (آل عمران: ۱۵۹) اور دوسری میں یہ ذکر ہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات مشورے سے طے پاتے ہیں (الشوریٰ: ۳۸)۔

مجبوریاں ہی مجبوریاں

یہاں یہ امر غور کے قابل ہے کہ رائے اور مشورہ لینے کی اجازت جب اسلام دیتا ہے تو اس پر مبنی شورائی نظام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جمہوریت کو سینے سے لگانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جمہوریت میں صرف عوامی رائے معلوم نہیں کی جاتی بلکہ مجبوراً کسی امر کا فیصلہ کثرت رائے سے کرنا پڑتا ہے اور یہ کچھ عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جمہوریت میں عوام حاکمیت اعلیٰ نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی اپنی کوئی رائے ہوتی ہے بلکہ ذرائع ابلاغ اور دولت کے وسائل پر قابض لوگ ان کی رائے کو بگاڑتے سنوارتے رہتے ہیں۔ عوام کی حیثیت اس خام مال کی ہوتی ہے جو چند سرمایہ داروں